سُوْرَةُ الْحِجْرِ

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ
سورۂ حجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ننانوے آیتیں اور چھ رکوع ہیں،
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①
۷ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی،
رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ②
کبھی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان،
ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③
چھوڑ دے ان کو کھالیں اور برت لیں اور امید میں لگے رہیں سو آئندہ معلوم کرلیں گے
وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ
اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر، نہ سبقت کرتا ہے
مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤
کوئی فرقہ اپنے وقت مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور

قرآن واضح کی (یعنی اس کی دونوں صفتیں ہیں، کامل کتاب ہونا بھی اور قرآن واضح ہونا بھی، ان کلمات سے قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے، یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، فرمایا رُبَمَا يَوَدُّ یعنی جب قیامت کے حشر و نشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو) کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار اس لئے کہ جب کوئی نئی شدت و مصیبت دیکھیں گے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی) آپ (دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور) ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے، کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور دنیا میں جو اُن کو ان کے کفر اور بدعملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا) اور ہم نے جتنی بستیاں (کفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لئے ایک معین وقت لکھا ہوا ہوتا رہا ہے اور (ہمارا اصول ہے کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے (بلکہ وقت مقرر پر ہلاک ہوتی ہے، اسی طرح جب اُن کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی)۔

معارف و مسائل

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا الخ سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو مقصد اور اصلی مشغلہ بنالینا اور دنیاوی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہو کر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی سے ہو سکتا ہے، جن کا آخرت اور اس کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، اور معاش کا بقدر ضرورت سامان کرتا ہے، اور آئندہ کاروبار کے منصوبے بھی بناتا ہے، مگر موت اور فکر آخرت سے غافل ہو کر یہ کام نہیں کرتا، اسی لئے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر رہتی ہے، اور فضول منصوبہ بندی کو مشغلہ نہیں بناتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بدنصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا (یعنی اپنے گناہوں، غفلتوں پر نادم ہو کر نہ رونا) اور سخت دلی، طولِ امل اور دنیا کی حرص (قرطبی عن مسند البزار عن انسؓ)

اور طولِ امل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور حرص میں انہماک اور موت و آخرت سے بے فکری کے ساتھ دور دراز کے منصوبے بنائے جائیں، (قرطبی) جو منصوبے دینی مقاصد

کے لئے یا کسی قوم وملک کے آئندہ مفاد کے لئے بنائے جاتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ وہ فکرِ آخرت ہی کی ایک صورت ہے۔

اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے پہلے طبقہ کی نجات ایمان کامل اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور آخری امت کے لوگ بخل اور طولِ امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جامع مسجد دمشق کے منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے اہل دمشق! کیا تم اپنے ایک ہمدرد خیر خواہ بھائی کی بات سنو گے سن لو کہ تم سے پہلے بہت بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں، جنھوں نے مال ومتاع بہت جمع کیا اور بڑے بڑے شاندار محلات تعمیر کئے اور دور دراز کے طویل منصوبے بنائے، آج وہ سب ہلاک ہو چکے ہیں، اُن کے مکانات، اُن کی قبریں ہیں، اور ان کی طویل امیدیں سب دھوکہ اور فریب ثابت ہوئیں، قوم عاد تمھارے قریب تھی جس نے اپنے آدمیوں سے اور ہر طرح کے مال ومتاع سے اور اسلحہ اور گھوڑوں سے ملک کو بھر دیا تھا، آج کوئی ہے جو ان کی وراثت مجھ سے دو درہم میں خریدنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی میں طویل امیدیں باندھتا ہے اس کا عمل ضرور خراب ہو جاتا ہے (قرطبی)

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے ، کیوں نہیں

تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ

لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے ، ہم نہیں اُتارتے

الْمَلٰۗىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝

فرشتوں کو مگر کام پورا کر کے اور اُس وقت نہ ملے گی اُن کو مہلت ۔

خلاصۂ تفسیر

(اِلَّا بِالْحَقِّ میں لفظ حق سے مراد فیصلۂ عذاب ہے، اور بعض مفسرین نے قرآن یا رسالت

کو مراد قرار دیا ہے، بیان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، یہ معنی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہیں، تفسیر آیات یہ ہے):۔

اور ان کفار (مکہ) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) یوں کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نعوذ باللہ) مجنون ہو (اور نبوت کا غلط دعویٰ کرتے ہو ورنہ) اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے (جو ہمارے سامنے تمہارے صدق کی گواہی دیں کقولہ تعالیٰ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جاتی (بلکہ جب اُن کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی متیقن ہو تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے جیسا کہ سورۂ انعام کے اوّل رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور (یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا معجز ہونا اس پر دلیل ہے، اور قرآن کے ایک اعجاز کا بیان تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسرا اعجاز یہ ہے کہ) ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں (اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا، جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے، یہ ایسا صریح معجزہ ہے جس کو ہر عام وخاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت وبلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک اَن پڑھ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے)۔

معارف ومسائل

مامون کے دربار کا ایک واقعہ

امام قرطبیؒ نے اس جگہ سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مامون کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار

میں علمی مسائل پر بحث و مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے جس میں ہر اہلِ علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا جو صورت، شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تو وہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی جب مجلس ختم ہوگئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے (امتحان لینے کے لئے) کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔

اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہوگئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا، اور مجلسِ مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سالِ گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا کہ اُس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے توٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھکر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے، جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہونچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں، جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔

اس واقعہ سے میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہوگیا، قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا انھوں نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہئے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحییٰ ابن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ قرآن عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ، یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات و انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و

نصاریٰ نے فریضۂ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں مسخ و محرّف ہو کر ضائع ہوگئیں، بخلاف قرآن کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی تو دشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطہ اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا، آج عہدِ رسالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس ہو چکے ہیں تمام دینی اور اسلامی امور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآن کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔

حفاظتِ قرآن کے وعدے میں حفاظتِ حدیث بھی داخل ہے

تمام اہلِ علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآنی کا نام ہے نہ صرف معانیِ قرآن کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامینِ قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامینِ قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا، کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھدے تو اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحفِ ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی زبان اردو یا انگریزی وغیرہ میں جو صرف ترجمہ قرآن کا شائع کر کے لوگ اس کو اردو یا انگریزی قرآن کا نام دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ وہ قرآن نہیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظِ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزء ہیں، تو حفاظتِ قرآن کی جو ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی اور مضامینِ قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ تعالیٰ ہی نے لے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانیِ قرآن وہی ہیں جن کے تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلا دیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو اُن کے لئے نازل کیا گیا ہے

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ، اور اسی لئے آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ، یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپؐ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی، انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیث رسولؐ کو غیر محفوظ کہنے والا درحقیقت قرآن کو غیر محفوظ کہتا ہے

جو لوگ آجکل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لئے قابلِ اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں مدوّن کیا گیا ہے۔
اوّل تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہدِ رسالتؐ میں شروع ہو چکی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کے علاوہ حدیث رسولؐ درحقیقت تفسیرِ قرآن اور معانیِ قرآن ہیں، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسولؐ) ضائع ہو جائیں؟

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٠﴾ وَمَا يَأْتِيهِمْ
اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں ، اور نہیں آتا اُن کے پاس
مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١١﴾ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ
کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی ، اسی طرح بٹھا دیتے ہیں ہم
فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٢﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
اس کو دل میں گنہگاروں کے ، یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم
الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿١٤﴾
پہلوں کی ، اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سارے دن اس میں چڑھتے رہیں
لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ﴿١٥﴾ ع ۱
تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہے ہماری نگاہ کو نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے

اَللُّغَاتُ اَلشِّيَعُ جمع شیعہ کی ہے، جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں، اور ایسے فرقہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں، مراد یہ ہو کہ ہم نے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اندر رسول بھیجے ہیں، اس میں لفظ اُمَمٍ کے بجائے فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہر گروہ کا رسول اسی گروہ کے لوگوں میں سے بھیجا گیا، تاکہ لوگوں کو اس پر اعتماد کرنا آسان ہو، اور یہ بھی اُن کی طبائع اور مزاج سے واقف ہو کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب پروگرام بنا سکے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی تکذیب سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے آپؐ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا، (اور ان کی یہ حالت تھی کہ) کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا (جو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوا تھا) اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرمین (یعنی کفارِ مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہے کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو درکنار اس سے بڑھ کر) اگر (خود ان کو آسمان پر بھیجدیا جائے اس طرح سے کہ) ہم اُن کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور اونگھ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو) اس (دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جاویں تب بھی یوں کہدیں کہ ہماری نظر بند کر دی گئی تھی (جس سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور در واقع میں نہیں چڑھ رہے، اور نظر بندی میں کچھ اسی واقعہ کی تخصیص نہیں) بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے (اگر ہم کو اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا جائے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا)۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾
اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا، ان آیات میں جو آگے

آرہی ہیں، اللہ جلّ شانہٗ کے وجود، توحید، علم، قدرت کے واضح دلائل، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات و مشاہدات سے بیان کئے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا،

اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو (ستاروں سے) آراستہ کیا۔

معارف و مسائل

بُرُوْجًا، بُرج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمہ تفسیر مجاہدؒ، قتادہؒ، ابو صالحؒ وغیرہ نے اس جگہ بُرُوج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جو ان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاءِ آسمانی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنی میں اطلاق عام و معروف ہے، جزم آسمان کو بھی سماء کہا جاتا ہے اور آسمان سے بہت نیچے جو فضاءِ آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جابجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیارات اور ستاروں کا آسمانوں کے اندر نہیں بلکہ فضاءِ آسمانی میں ہونا اگر مکمل تحقیق قرآن کریم کی آیات سے نیز قدیم و جدید علم فلکیات کی تحقیق سے انشاء اللہ سورۂ فرقان کی آیت تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا کی تفسیر میں آئے گی۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سن بھاگا سو

فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا۔

خلاصۂ تفسیر

آسمان کو (ستاروں کے ذریعہ) ہر شیطان مردود سے محفوظ فرما دیا کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی) ہاں مگر کوئی بات (فرشتوں کی) چوری سے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے، (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بدحواس ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

شہابِ ثاقب

ان آیات سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ شیاطین کی رسائی آسمانوں تک نہیں ہو سکتی ابلیس لعین کا تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت آسمانوں میں ہونا اور آدم و حوا علیہما السلام کو دھوکہ میں مبتلا کرنا وغیرہ یہ سب آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول سے پہلے کے واقعات ہیں، اس وقت تک جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع نہیں تھا، نزولِ آدم علیہ السلام اور اخراج شیطان کے بعد سے یہ داخلہ ممنوع ہوا، سورۂ جن کی آیات میں جو یہ مذکور ہے اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک شیاطین آسمانوں کی خبریں فرشتوں کی باہمی گفتگو سے سن لیا کرتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین آسمانوں میں داخل ہو کر سنتے تھے، نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ کے الفاظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چوروں کی طرح آسمانی فضاء میں جہاں بادل ہوتے ہیں چھپ کر بیٹھ جاتے اور سن لیا کرتے تھے، ان الفاظ سے خود بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ قبل بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا، مگر فضاءِ آسمانی تک پہونچ کر چوری سے کچھ سن لیا کرتے تھے، بعثتِ نبویؐ کے بعد حفاظتِ وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا۔

رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سن سکتے تھے، سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں، بہت ممکن ہے کہ اجرامِ سماویہ سماعتِ اصوات سے مانع نہ ہوں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں کبھی کسی وقت یہاں تک اترتے ہیں، اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں، شیاطین اسی فضاءِ آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہابِ ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورۂ جن میں اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ کی تفسیر میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ: ان آیات میں شہابِ ثاقب کا ہے قرآنِ کریم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظتِ وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے، تاکہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سن سکیں۔

اس میں ایک اشکال قوی یہ ہے کہ فضائے آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ عہدِ نبوی کی خصوصیت ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں، اوپر جا کر جب اُن کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہونچتی ہے تو وہ سُلگ اُٹھتے ہیں، اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارا ٹوٹا ہے، اسی لئے محاورات میں اس کو ستارا ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے (انقضاضِ کوکب) کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، زمین سے اُٹھنے والے بخارات مشتعل ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہوا، مگر بعثتِ نبوی سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا، کہ شیاطین جو فرشتوں کی باتیں چوری سے سننا چاہیں ان کو اس شعلے سے مارا جائے۔

علامہ آلوسیؒ نے رُوح المعانی میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور نقل کیا ہے کہ امام حدیث زہریؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں! اس پر اس نے سورۂ جن کی مذکورہ آیت معارضہ کے لئے پیش کی تو فرمایا کہ شہاب ثاقب تو پہلے بھی تھے، مگر بعثتِ نبوی کے بعد جب شیاطین پر تشدد کیا گیا تو ان سے شیاطین کے دفع کرنے کا کام لے لیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباسؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے، کہ ستارہ ٹوٹا، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم زمانۂ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرے گا، یا پیدا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ یہ لغو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن

کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں، مقصدِ قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیئے اس پر بوجھ اور اُگائی اس میں

كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ

ہر چیز اندازے سے، اور بنا دیئے تمہارے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں

لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا

جن کو تم روزی نہیں دیتے، اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور

نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٢١﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ

اتارتے ہیں ہم اندازہ معین پر، اور چلائیں ہم نے ہوائیں رس بھری،

فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا اور تمہارے پاس نہیں

بِخٰزِنِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿٢٣﴾

اس کا خزانہ، اور ہم ہی ہیں جلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے،

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿٢٤﴾

اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۡ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾

اور تیرا رب وہی اکٹھا کرلائے گا ان کو بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس زمین میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی (ضرورت کی پیداوار) ایک معین مقدار سے اُگائی، اور ہم نے تمہارے واسطے اس (زمین) میں معاش کے سامان بنائے (جس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے پہننے

اور رہنے سہنے سے متعلق ہیں) اور یہ سامانِ معاش اور ضروریاتِ زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا، بلکہ) ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے (یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورد و نوش اور زندگی گذارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو چوپائے بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریات معاش حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے بری اور بحری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامانِ معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور یہ جانور اتنے بے حد و بے شمار ہیں کہ انسان نہ ان سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کر سکتا ہے) اور جتنی چیزیں (ضروریاتِ زندگی سے متعلق) ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز) کو ایک معین مقدار سے اُتارتے رہتے ہیں اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے، (کہ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے) اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور (سب کے مرنے کے بعد) ہم ہی باقی رہ جاویں گے، اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) محشور فرماوے گا (یہ اس لئے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، اس میں منکرِ توحید کی سزا کی طرف اشارہ کر دیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دیگا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے)۔

معارف و مسائل

حکمتِ الٰہیہ، ضروریاتِ معاش میں تناسب و موزونیت

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ترجمہ میں لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر آگنے والی چیز کی ایک مقدار معین آگائی جس سے کم ہو جاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جائیں، اور زیادہ ہو جاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی، انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ پھل اگر اتنے زیادہ پیدا ہو جائیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑیں گے، ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا، اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی نہ رہیگی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر

انسان کی زندگی موقوف ہے، ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مفت مل جایا کرتے، اور بے فکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی اُن کے بڑے بڑے ذخیرے پڑے رہتے، لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا، اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے، کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بنیں۔

اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اُگنے والی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تناسب اور موزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس سے اس میں حسن اور دل کشی پیدا ہوتی ہے، مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل، مختلف سائز اور مختلف شکل، مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آب رسانی اور آبپاشی کا عجیب و غریب نظامِ الٰہی

وَاَنْزَلْنَا الرِّيٰحَ سے مَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ تک قدرتِ الٰہیہ کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، چرندوں، پرندوں، درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق آب رسانی کا ایسا نظامِ محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں، درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے، اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے، پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، نہ کسی سے مانگی جاتی ہے

اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرتِ الٰہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے، کہ سمندر میں بخارات پیدا فرمائے جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں، جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنا دیں، پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہونچانا ہے پہونچا دیں، پھر فرمانِ الٰہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے، اس کے مطابق یہ خودکار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھر بیٹھے مل جائے، اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے، کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے، حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا ذخیرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے

اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں، اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جاکر پڑتا ہے، اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا، اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی بھی مشکل ہو جاتی، اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھارا بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلاظتیں اس میں پہونچ کر بھسم ہو جاتی ہیں، غرض اس حکمت کی بناء پر سمندر کا پانی کھارا بلکہ تلخ بنایا گیا، جو نہ پیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، نظامِ قدرت نے جو پانی کے ہوائی جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بغیر کسی ظاہری مشین کے پیدا کر دیئے کہ اس پانی کا نمک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا، سورۂ مرسلٰت میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔
وَّ اَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا، اس میں لفظ فرات کے معنی ہیں ایسا میٹھا پانی جس سے پیاس بجھے، معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گذار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تمہارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔

سورۂ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا ہے: اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ "بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے"۔

یہاں تک تو قدرتِ الٰہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے پورے روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس حسین نظام کیسا پہونچایا کہ ہر خطہ کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ اُن جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں، گھر بیٹھے پانی پہونچا دیا، اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہونچا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا کیونکہ پانی اُن کی ایسی ضرورت ہے جس کی احتیاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے، اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہوا کرتی، لیکن اس صورت میں اُن کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی، مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا، اس کا اندازہ کسی اہلِ تجربہ کے لئے مشکل نہیں، سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطّل پیدا کرتی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جاتی کہ اس کا پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جاتا، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ

مقرر کر کے اس کے سپرد کیا جاتا کہ وہ اپنے کوٹہ اور حصہ کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔

اندازہ لگایئے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا جن میں تین یا چھ مہینہ کی ضرورت کا پانی جمع کر کے رکھ لے، اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر ہے کہ چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جاتا، اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا، اس لئے قدرتِ الٰہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقتِ ضرورت ہر جگہ مل جانے کا ایک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا، کہ جو پانی برسایا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں، کھیتوں اور انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آہی جاتا ہے، کچھ کھلے تالابوں، جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے، اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بحرِ منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے، جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی، پھر اگر وہ پانی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعے کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہونچ جانے کا خطرہ رہتا، پرندے جانوروں کے اس میں گرنے مرنے کا اندیشہ رہتا، جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا، مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بحرِ منجمد (برف) بنا کر پہاڑوں پر لاد دیا جہاں سے تھوڑا تھوڑا رِس کر وہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور پھر چشموں کی صورت میں ہر جگہ پہونچ جاتا ہے، اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی تہہ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہے اور کنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آب رسانی کا یہ نظامِ الٰہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اوّل تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے، پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہونچانا دوسری نعمت ہے، پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنا دینا تیسری نعمت ہے، پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے، پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظامِ محکم پانچویں نعمت ہے، پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے، کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ اُن کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو، قرآن کریم کی آیت فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ۝ میں انہی نعماءِ الٰہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے میں درجات کا فرق

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ۝ میں مستقدمین اور مستاخرین کی چند تفسیریں ائمہ صحابہ و تابعین سے مختلف منقول ہیں،۔ مستقدمین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستاخرین وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے (قتادہ و عکرمہ) مستقدمین سے مراد اموات ہیں اور مستاخرین سے وہ لوگ جو آ

زندہ ہیں (ابن عباس وضحاک) مستقدمین سے مراد امتِ محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستاخرین سے امتِ محمدیہ (مجاہد) مستقدمین سے مراد اہلِ طاعت وخیر ہیں اور مستاخرین سے اہلِ معصیت وغفلت (حسن وقتادہ) مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوف یا جہاد کی صفوف اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستاخرین وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں، حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ کا علم محیط ان تمام اقسام کے مستقدمین ومستاخرین پر حاوی ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیۃ سے نماز میں صفِ اوّل اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان کہنے اور نماز کی صفِ اوّل میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہو تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعبؒ آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید اگلی صفوف میں اللہ کا کوئی بندہ اس شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے، انتہیٰ کلامہٗ۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اصل فضیلت تو صفِ اوّل ہی میں ہے، جیسا کہ آیتِ قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا، لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صفِ اوّل میں جگہ نہ ملی تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید اگلی صفوف کے کسی نیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے، اور آیتِ مذکورہ میں جیسے نماز کی صفِ اوّل کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صفِ اوّل کی فضیلت بھی ثابت ہو گئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے،

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ

اور جن کو بنایا ہم نے اس سے پہلے لُو کی آگ سے، اور جب کہا

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے،

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

پھر جب ٹھیک کروں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر، مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ

يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ

ہو سجدہ کرنے والوں کے، فرمایا، اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا

السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ

سجدہ کرنے والوں کے، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کھنکھناتے

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ

سنے ہوئے گارے سے، فرمایا تو نکل یہاں سے تجھ پر مار ہے، اور تجھ پر

عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى

پھٹکار ہے اس دن تک کہ انصاف ہو، بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اس دن تک کہ

يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ

مُردے زندہ ہوں، فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی، اس مقرر وقت کے دن

الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

تک، بولا اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو، مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں،

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی، جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ

سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ

زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا بہکے ہوؤں میں ، اور دوزخ پر وعدہ ہے ان

اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ

سب کا ، اس کے سات دروازے ہیں ، ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے

جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصلِ اوّل آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا (یعنی اوّل گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بُو آنے لگی، پھر وہ خشک ہو گیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹکی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پُتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابوالجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے (مطلب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزاءِ دخانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی، کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزاءِ کثیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ) اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پُتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضائے جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنا لیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر و ذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے کیونکہ میں نورانی مادۂ آتش

سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کروں) ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل، کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہے گی (جیسا دوسری آیت میں ہے عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ، یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے بعید رہے گا، توبہ کی توفیق نہ ہوگی اور مقبول و مرحوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ قیامت تک جو محلِ رحمت نہ ہو تو پھر قیامت میں تو مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں، پس جس وقت تک احتمال تھا اس کی نفی کر دی، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ مقصود قیامت تک عمر دینا نہیں ہو کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیاتِ دنیویہ میں تو ملعون ہے گو وہ قیامت تک ممتد کیوں نہ ہو) کہنے لگا (کہ اگر مجھ کو آدمؑ کی وجہ سے مردود کیا ہے) تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدمؑ اور اولادِ آدم کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے اُن بندوں کے جو اُن میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ (منتخب ہو جانا جس کا طریقہ اعمالِ صالحہ و اطاعت کاملہ ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر ہمارا مقرب ہو جاتا ہے) واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے کو)

معارف و مسائل

بدنِ انسانی میں نفخِ روح اور اس کو مسجودِ ملائکہ بنانے کی مختصر تحقیق

روح کوئی جسم ہے یا جوہر مجرّد، اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبدالرءوف مناوی نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہونچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جا سکتا، امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرد ہے، امام رازی نے اس کے بارہ دلائل پیش کئے ہیں۔

مگر جمہور علماءِ امت روح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی پھونک مارنے

کے ہیں، اگر بقول جمہور رُوح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جو ہر مجرد مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)

روح اور نفس کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہؒ کی تحقیق

یہاں اس طویل الذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفاء کیا جاتا ہے جو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ رُوح کی دو قسم ہیں، علوی اور سفلی، روحِ علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہلِ کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے، اور رُوح علوی بنظرِ کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، سِرّ، خفی، اخفیٰ، اور یہ سب عالمِ امر کے لطائف میں سے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔

اور رُوحِ سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدنِ انسانی کے عناصرِ اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس رُوحِ سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے، ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے، اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے، اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح ارواحِ علویہ اگرچہ اپنے تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع اور بہت مسافتِ بعیدہ پر ہیں مگر ان کا عکس اس رُوحِ سفلی کے آئینہ میں آکر ارواحِ علویہ کی کیفیات و آثار اس میں منتقل کر دیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے ارواحِ جزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ رُوحِ سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدنِ انسانی میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، رُوحِ سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، یہ روحِ سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو شرائین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدنِ انسانی کے ہر حصہ میں پہونچ جاتی ہے۔

رُوحِ سفلی کے بدنِ انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخِ رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کو اپنی طرف منسوب کر کے مِنْ رُّوْحِیْ اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روحِ انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے، کیونکہ وہ بغیر مادہ کے محض امرِ الٰہی سے پیدا ہوئی ہے، نیز اس میں تجلیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی رُوح میں نہیں ہے۔

اور انسان کی پیدائش میں اگرچہ عنصرِ غالب مٹی کا ہے، اور اسی لئے قرآن عزیز میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ دس چیزوں کا جامع ہے جن میں پانچ عالمِ خلق کی ہیں اور پانچ عالمِ امر کی، عالمِ خلق کے چار عنصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، اور پانچواں ان چاروں سے پیدا ہونے والا بخار لطیف جس کو رُوحِ سفلی یا نفس کہا جاتا ہے، اور عالمِ امر کی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی قلب، روح، سِرّ، خفی، اخفیٰ۔

اسی جامعیت کے سبب انسان خلافتِ الٰہیہ کا مستحق بنا، اور نورِ معرفت اور نارِ عشق و محبت کا محل ہوا، جس کا نتیجہ بے کیف معیتِ الٰہیہ کا حصول ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ، "یعنی ہر انسان اس فرد کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے"۔

اور انسان میں تجلیاتِ الٰہیہ کی قابلیت اور معیتِ الٰہیہ کا جو درجہ اس کو حاصل ہے، اسی کی وجہ سے حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا جائے، ارشاد ہوا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ

حکمِ سجدہ فرشتوں کو ہوا تھا ابلیس اس میں تبعاً شامل قرار دیا گیا

سورۂ اعراف میں ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ ابلیس کو بھی دیا گیا تھا، اسی لئے اس سورت کی جو آیات ابھی آپ نے پڑھی ہیں جن سے بظاہر اس حکم کا فرشتوں کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اصالۃً یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کے اندر موجود تھا، اس لئے تبعاً وہ بھی اس حکم میں شامل تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لئے جب اللہ تعالیٰ کی بزرگترین مخلوق فرشتوں کو حکم دیا گیا تو دوسری مخلوق کا تبعاً اس حکم میں داخل ہونا بالکل ظاہر تھا، اسی لئے ابلیس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کا حکم دیا ہی نہیں گیا تو عدمِ تعمیل کا جرم مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اور شاید قرآن کریم کے الفاظ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ اَبٰۤی اَنْ یَّسْجُدَ کے بجائے اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ذکر فرمایا جس سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل ساجدین تو فرشتے ہی تھے، مگر عقلاً لازم تھا کہ

ابلیس بھی جب ان میں موجود تھا تو وہ بھی ملائکہ ساجدین کے ساتھ شامل ہو جاتا، اس کے عدم شمول پر عتاب فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کے معنی

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا، مگر اسی واقعہ آدم میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدم و حوا پر اس کا فریب چل گیا، اسی طرح صحابۂ کرام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب و عقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا، کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے۔

اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں، کیونکہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ کی اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہؓ نے بھی توبہ کر لی تھی، اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلاء ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

جہنم کے سات دروازے

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، امام احمدؒ، ابن جریر طبریؒ اور بیہقی نے بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ لکھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے اوپر نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے، ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا (قرطبی)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾	
پرہیزگار رہیں باغوں میں اور چشموں میں، کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے جمع خاطر سے	
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ	
اور نکال ڈالی ہم نے جو اُن کے جیوں میں تھی خفگی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے	
مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴿۴۸﴾	
آمنے سامنے، نہ پہنچے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے	

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ	
خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب	
	الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿۵۰﴾
	وہی عذاب دردناک ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہل ایمان) باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے، (خواہ اول ہی سے اگر معصیت نہ ہوئی یا معاف ہو گئی ہو اور خواہ سزائے معصیت بھگتنے کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ) تم ان (جنات و عیون) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو (یعنی اس وقت بھی ہر ناپسند چیز سے سلامتی ہے، اور آئندہ بھی کسی شر کا اندیشہ نہیں) اور (دنیا میں طبعی تقاضے سے) ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب (ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے کے قبل ہی) دور کر دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے، تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے مطلع ہو کر ایمان اور تقویٰ کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب سے پہلے ان کے سامنے پانی کے دو چشمے پیش کئے جائیں گے، پہلے چشمہ سے وہ پانی پئیں گے تو ان سب کے دلوں سے باہمی رنجش جو کبھی دنیا میں پیش آئی تھی، اور طبعی طور پر اس کا اثر آخر تک موجود رہا وہ سب دھل جائے گی، اور سب کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائیگی، کیونکہ باہمی رنجش بھی ایک تکلیف و عذاب ہے، اور جنت ہر تکلیف سے پاک ہے۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کینہ کسی مسلمان سے ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا، اس سے مراد وہ کینہ اور بغض ہے جو دنیوی غرض سے اور اپنے قصد و اختیار سے ہو اور اس کی وجہ سے یہ شخص اس کے درپے رہے کہ جب موقع پائے

اپنے دشمن کو تکلیف اور نقصان پہونچائے، طبعی انقباض جو خاصہ بشری اور غیر اختیاری ہے وہ اس میں داخل نہیں، اسی طرح جو کسی شرعی بنیاد پر مبنی ہو، ایسے ہی بغض و انقباض کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اہل جنت کے دلوں سے ہر طرح کا انقباض اور رنجش دور کر دی جائے گی۔

اسی کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ: "مجھے امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے دلوں کا غبار جنت میں داخلہ کے وقت دور کر دیا جائے گا" اشارہ اُن اختلافات و مشاجرات کی طرف ہے جو ان حضرات اور حضرت علیؓ کے درمیان پیش آئے تھے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ اس آیت سے جنت کی دو خصوصیات معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہوگا، بخلاف دنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے، خالص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی، نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے اس شخص کو نکالا جائے گا، سورۂ صٓ میں ارشاد ہے اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ، یعنی یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اس آیت میں فرمایا وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ، یعنی ان کو کبھی ان نعمتوں راحتوں سے نکالا نہیں جائے گا، بخلاف معاملاتِ دنیا کے کہ یہاں اگر کوئی کسی کو بڑے سے بڑا انعام و راحت دے بھی دے تو یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ جس نے یہ انعامات دیئے ہیں وہ کسی وقت ناراض ہو کر یہاں سے نکال دے گا۔

ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اُکتا جائے اور باہر جانا چاہے، قرآن عزیز نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کر دیا ہے کہ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا، یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا
اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا، جب چلے آئے اس کے گھر میں اور بولے
سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا
سلام وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، بولے ڈر مت ہم تجھ کو

نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ
خوش خبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی، بولا کیا خوش خبری سناتے ہو مجھ کو جب پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا
فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۝ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝
اب کاہے پر خوش خبری سناتے ہو، بولے ہم نے تجھ کو خوش خبری سنائی بھی سو مت ہو تو نا امیدوں میں،
قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ۝ قَالَ
بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں، بولا پھر
فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ
کیا مہم ہے تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوؤ، بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم
مُّجْرِمِيْنَ ۝ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ
گنہگار پر، مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچالیں گے سب کو، مگر ایک اسکی عورت
قَدَّرْنَا ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِ ۨ الْمُرْسَلُوْنَ ۝
ہم نے ٹھہرا لیا، وہ رہ جانے والوں میں، پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے
قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا
بولا تم لوگ ہو اوپرے، بولے نہیں پر ہم لیکر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں
فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝
وہ جھگڑتے تھے، اور ہم لائے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں،
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ
سو لے نکل اپنے گھر والوں کو کچھ رات رہے سے، اور تو چل اُن کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے
مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۝ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ
تم میں سے کوئی، اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے، اور مقرر کر دی ہم نے اس کو
ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَ
یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے، اور
جَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ
آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے، لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں

فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ

سو مجھ کو رسوا مت کرو ، اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ ، بولے کیا ہم نے تجھ کو منع

نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

نہیں کیا جہان کی حمایت سے ، بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے ،

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں ، پھر آپکڑا ان کو چنگھاڑ

الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا

نے سورج نکلتے وقت ، پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے

عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ان پر پتھر کھنگر کے ، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنیوالوں کو

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور وہ بستی واقع ہے سیدھی راہ پر ، البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (لوگوں) کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجئے (وہ قصہ اسوقت واقع ہوا تھا) جب کہ وہ (مہمان جو کہ واقع میں فرشتے تھے، اور بشکلِ انسانی ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان سمجھا) ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے پھر (آکر) انھوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے لئے کھانا تیار کر کے لائے، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے، انھوں نے کھایا نہیں تب) ابراہیم (علیہ السلام دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے کیونکہ وہ فرشتے بشکلِ بشر تھے ان کو بشر ہی سمجھا اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں مخالف نہ ہوں اور) کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے ہیں منجانب اللہ ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور) آپ کو ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ

علم انبیاء کو ہوتا ہے، مراد اس فرزند سے اسحٰق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے) ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بوڑھاپا آگیا سو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (مطلب یہ کہ یہ امر فی نفسہٖ عجیب ہے، نہ یہ کہ قدرت سے بعید ہے) وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی تولدِ فرزند یقیناً ہونے والا ہے) سو آپ ناامید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے اسباب عادیہ پر نظر کرنے سے وساوس ناامیدی کے غالب ہوتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت سے کب موصوف ہو سکتا ہوں، محض مقصود اس امر کا عجیب ہونا ہے، باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہے) بعد اس کے فراستِ نبوت سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے علاوہ بشارت کے اور بھی کوئی اہم عظیم مقصود ہے اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرائن سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے) تو (یہ بتلاؤ کہ) اب تم کو کیا اہم درپیش ہے اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچالیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلا دیں گے کہ ان مجرموں سے علٰحدہ ہو جائیں) بجز ان کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بی بی کے کہ اس کی نسبت ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی)۔

پھر جب وہ فرشتے خاندانِ لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ بشکلِ بشر تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی (معلوم ہوتے) ہو، (دیکھئے شہر والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں) انھوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں، سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر (یہاں سے) چلے جائیے، اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لوٹ نہ جائے، اور آپ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت کر دی گئی ہے) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) اور جس جگہ (جانے کا) تم کو حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (تفسیر درمنثور میں بحوالہ سدی نقل کیا ہے

کہ وہ جگہ ملکِ شام ہے، جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرات کو حکم دیا گیا تھا) اور ہم نے ان فرشتوں کے واسطے سے) لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی بالکل اُن کی جڑ کٹ جائیگی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہو جائیں گے، فرشتوں کی یہ گفتگو وقوع کے اعتبار سے اس قصہ کے بعد ہوئی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے، لیکن اس کو ذکر کرنے میں اس لئے مقدم کر دیا کہ قصہ بیان کرنے سے جو بات مقصود ہے، یعنی نافرمانوں پر عذاب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی وہ پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہو جائے، اگلا قصہ یہ ہے) اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں حسین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسد نیت اور بُرے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر پہونچے) لوط (علیہ السلام) نے (جو اب تک ان کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے ان کے فاسد ارادوں کا احساس کرکے) فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کرکے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان پردیسیوں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں، اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہے) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں) وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں آپنے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ ان کو مہمان بنایا) کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں (کو اپنا مہمان بنانے سے بارہا) منع نہیں کرچکے (نہ آپ ان کو مہمان بناتے نہ اس رسوائی کی نوبت آتی) لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو بتلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، قضاءِ شہوت کے طبعی تقاضے کے لئے) یہ میری (بہو بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں اگر تم میرا کہنا کرو (تو شریفانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سنتے تھے) آپ کی جان کی قسم، اپنی مستی میں مدہوش تھے، پس سورج نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدبایا (یہ ترجمہ مُشرقین کا ہے، اس سے پہلے جو مُصبحین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی صبح ہوتے ہوتے کے ہیں، ان دونوں کا اجتماع اس اعتبار سے ممکن ہو کہ صبح سے ابتداء ہوئی اور اشراق تک خاتمہ ہوا) پھر (اس سخت آواز کے بعد) ہم نے ان بستیوں (کی زمین) کو اُلٹ کر اُن کا اوپر کا تختہ (تو) نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہلِ بصیرت کے لئے (مثلاً ایک تو یہ کہ بُرے فعل کا نتیجہ آخرکار بُرا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور ڈھیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، (دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت و عزت

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرکے فریب میں مبتلا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ وغیر ذٰلک

معارف و مسائل

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اعزاز و اکرام

قولہ لَعَمْرُكَ روح المعانی میں جمہور مفسرین کا قول یہ نقل کیا ہے کہ لَعَمْرُكَ کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات کی قسم کھائی ہے، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور ابو نعیم و ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات و کائنات میں کسی کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت و مرتبہ عطا نہیں فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر یا کسی فرشتے کی حیات پر کبھی قسم نہیں کھائی اور اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر و حیات کی قسم کھائی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا

کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے، کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے، اور ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو (رواہ ابوداؤد والنسائی عن ابی ہریرۃ)

اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا کہ "خبردار رہو اللہ تعالیٰ باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کرے ورنہ خاموش رہے (قرطبی، مائدہ)

لیکن یہ حکم عام مخلوقات کے لئے ہے، اللہ جل شانہٗ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں، یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے اس چیز کا اشرف اور عظیم النفع ہونا بیان کرنا ہے، اور عام مخلوق کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں، کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے

مخصوص ہے۔

جن بستیوں پر عذاب نازل ہوا ان سے عبرت حاصل کرنا چاہئے

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ وَاِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ اس میں حق تعالیٰ نے ان بستیوں کا محلِ وقوع بیان فرمایا جو عرب سے شام تک جانے والے راستہ پر ہیں، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ان میں اہلِ بصیرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ان کے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے تِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِیْلًا، یعنی یہ بستیاں عذابِ الٰہی کے ذریعہ ویران ہونے کے بعد پھر دوبارہ آباد نہیں ہوئیں، بجز چند بستیوں کے۔" اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان بستیوں اور ان کے مکانات کو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بنایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان مقامات سے گذرے ہیں تو آپ پر ہیبتِ حق کا ایک خاص حال ہوتا تھا جس سے سرِ مبارک جھک جاتا تھا، اور آپ اپنی سواری کو ان مقامات میں تیز کر کے جلد عبور کرنے کی سعی فرماتے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے یہ سنت قائم کر دی کہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے اُن کو تماشا گاہ بنانا بڑی قساوت ہے بلکہ ان سے عبرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا احضار اور اس کے عذاب کا خوف طاری ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تختہ اُلٹا گیا ہے، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق عرب سے شام کو جانے والے راستہ پر اردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطحِ سمندر سے کافی گہرائی میں ایک عظیم صحرا کی صورت میں موجود ہے، اس کے ایک بہت بڑے رقبہ پر ایک خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، اس پانی میں کوئی مچھلی، مینڈک وغیرہ جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحرِ میّت اور بحرِ لوط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اس میں پانی کے اجزاء بہت کم اور نمک کی قسم کے اجزاء زیادہ ہیں، اس لئے اس میں کوئی دریائی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آجکل آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنا دیئے ہیں، اور آخرت سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آجکل اس کو ایک سیرگاہ بنایا ہوا ہے، لوگ تماشے کے طور پر اسے دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم نے اسی غفلت شعاری پر تنبیہ کیلئے آخر میں فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ، یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشمِ بصیرت رکھنے والے کیلئے عبرت آموز ہیں، لیکن اس عبرت سے فائدہ اٹھانے والے مؤمنین ہی ہوتے ہیں، دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر واپس ہو جاتے ہیں

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا	اور بن کے رہنے والے گنہگار، سو ہم نے بدلہ لیا اُن سے اور یہ دونوں
لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۸۰﴾	بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر، اور بیشک جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو،
وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا یَنْحِتُوْنَ مِنَ	اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں پھر رہے ان سے منہ پھیرتے، اور تھے کہ تراشتے تھے
الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ﴿۸۳﴾	پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ، پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے صبح ہونے کے وقت
فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ	پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کماتا تھا، اور ہم نے بنائے نہیں آسمان
وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ	اور زمین اور جو اُن کے بیچ میں ہے بغیر تحت، اور قیامت بیشک
لَاٰتِیَةٌ ؕ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ	آنے والی ہے سو کنارہ کر اچھی طرح کنارہ، تیرا رب جو ہے وہی ہے
الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۶﴾	پیدا کرنے والا خبردار۔

خلاصۂ تفسیر

قصۂ اصحابِ ایکہ اور اصحابِ حجر

اور بن والے (یعنی شعیب علیہ السلام کی امت بھی) بڑے ظالم تھے سو ہم نے ان سے (بھی) بدلہ لیا (اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا) اور دونوں (قوم کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں (اور شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں) اور حجر (یعنی حجاز) والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھوٹا بتلایا (کیونکہ جب صالح علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا) اور ہم نے انکو اپنی طرف سے نشانیاں دیں (جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید اور

حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوتی تھی مثلاً دلائل توحید اور ناقہ کہ معجزہ صالح علیہ السلام کا تھا) سو وہ لوگ ان (نشانیوں) سے روگردانی (ہی) کرتے رہے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ (ان میں سب آفات سے) امن میں رہیں سو ان کو صبح کے وقت (خواہ اوّل ہی صبح میں یا دن چڑھے، علی الاحتمالین) آواز سخت نے آپکڑا سو ان کے (دنیوی) ہنر ان کے کچھ بھی کام آئے (ان ہی مستحکم گھروں میں عذاب سے کام تمام ہوگیا، اس آفت سے اُن کے گھروں نے نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو احتمال بھی نہ تھا، اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتے)۔

معارف ومسائل

آیکہ، بن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مدین کے پاس ایک بن تھا، اس لئے آیکہ اصحاب مدین ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحاب آیکہ اور اصحاب مدین دو علٰحدہ علٰحدہ قومیں تھیں، ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ: "اِنَّ مَدْیَنَ وَاَصْحَابَ الْاَیْکَۃِ اُمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَیْھِمَا شُعَیْبًا" واللہ اعلم

اور حجر ایک وادی ہے جو حجاز وشام کے درمیان واقع ہے، اس میں قوم ثمود آباد تھی۔

شروع سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ کو جو شدید عناد و مخالفت تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جارہا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

بقیہ خلاصۂ تفسیر | اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کے عناد و خلاف سے غم نہ کیجئے کیونکہ اس کا ایک روز فیصلہ ہونے والا ہے، اور وہ روز قیامت ہے، جس کی آمد کے متعلق ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صانع عالم کے وجود اور وحدت وعظمت پر استدلال کرکے اس کے احکام کی اطاعت کریں، اور بعد اقامت اس حجت کے جو ایسا نہ کرے وہ معذب ہو) اور (دنیا میں پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے اس کے لئے قیامت مقرر ہے پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو بھگتنا یا جائے گا) سو آپ (کچھ غم نہ کیجئے بلکہ خوبی کے ساتھ (ان کی شرارتوں سے) درگذر کیجئے (درگذر کا مطلب یہ ہے کہ اس غم میں نہ پڑیئے، اس کا خیال نہ کیجئے، اور خوبی یہ کہ شکوہ وشکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ

بلاشبہ آپ کا رب (چونکہ) بڑا خالق (ہے اس سے ثابت ہوا کہ) بڑا عالم (بھی) ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے آپ کے صبر کا بھی ان کی شرارت کا بھی، اس لئے ان سے پورا پورا بدلہ لے لے گا)۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا، مت ڈال اپنی

عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے، اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانیوالا کھول کر

كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾

جیسا ہم نے بھیجا ہے اُن بانٹنے والوں پر، جنھوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے، جو کچھ وہ کرتے تھے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ

سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پروا نہ کر مشرکوں کی، ہم بس ہیں تیری طرف سے

الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ

ٹھٹھے کرنے والوں کو، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی،

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ

سو عنقریب معلوم کرلیں گے، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رُکتا ہے ان کی

بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنیوالوں سے

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور بندگی کئے جا اپنے رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

خلاصۂ تفسیر

اور (آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ موجب غم ہوتا ہے، ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے، کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر لطف وعنایت ہے چنانچہ) ہم نے آپ کو (ایک بڑی بھاری نعمت یعنی) سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع مضامین عظیمہ ہونے کے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جاوے کہ) قرآن عظیم دیا (مراد اس سے سورۂ فاتحہ ہے جس کی عظمت کی وجہ سے اس کا نام اُمّ القرآن بھی ہے، پس اس نعمت اور منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ آپ کا قلب مسرور ومطمئن ہو، ان لوگوں کے عناد وخلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور) آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے (نہ بلحاظ افسوس نہ بلحاظ نارضگی) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو (مثلاً یہود ونصاریٰ مجوس اور مشرکین کو) برتنے کے لئے دے رکھی ہے اور بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی) اور ان (کی حالت کفر) پر (کچھ) غم نہ کیجئے (بلحاظ نارضگی نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ وہ دشمن خدا ہیں اس لئے بوجہ تبغض فی اللہ غصہ آئے کہ ایسی نعمتیں ان کے پاس نہ ہوتیں، اس کے جواب کی طرف مَتَّعْنَا میں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں کہ ان مبغوضین کے پاس نہ ہوتیں، یہ تو متاع فانی ہے، بہت جلد جاتا رہے گا، اور بلحاظ افسوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آئیں، اس کا جواب لَا تَحْزَنْ میں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اُن کی طینت میں حد درجہ عناد ہے، ان سے کسی طرح توقع نہیں، اور حزن ہوتا ہے خلافِ توقع پر جب توقع نہیں تو پھر حزن بے وجہ ہے، اور بہ لحاظ حرص نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر وغم میں نہ پڑیئے) اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے) اور (کافروں کے لئے چونکہ فکر مصلحت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے، اور اتنا) کہہ دیجئے کہ میں کھلم کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانیوالا ہوں (اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (مختلف اوقات گذشتہ میں) نازل کیا ہے جنہوں نے (احکام الٰہی کے) حصے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیتے تھے (ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا جو مرضی کے خلاف ہوا اس سے

انکار کر دیا، مراد اس سے سابق یہود ونصاریٰ ہیں جن پر مخالفتِ انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے عذابوں کا ہونا مثل مسخ بصورتِ بندر وخنزیر، قید، قتل اور ذلت مشہور ومعروف تھا، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا امر بعید نہیں، پہلے ہو چکا ہے اگر تم پر بھی ہو جائے تو تعجب کی کونسی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں، اور جب تقریر مذکور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح پچھلے لوگ مخالفتِ انبیاء کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں) سو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب (لوگوں اور پچھلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے) غرض (حاصلِ کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے) کا حکم کیا گیا ہے اس کو (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور (اگر یہ نہ مانیں تو) ان مشرکوں (کے نہ ماننے کی (مطلق) پروا نہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے، جیسا اوپر آیا ہے لَا تَحْزَنْ)، اور نہ طبعی طور پر خوف سمجھئے کہ یہ مخالف بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں چنانچہ آپ پر تو) ہنستے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان (کے شر وایذاء) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (کہ استہزاء اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاہے کا خوف ہے) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر واستہزاء کی) باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آجائے (یعنی مرتے دم تک ذکر وعبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر وثواب کے علاوہ یہ خاصیت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج وغم اور تکلیف ومصیبت ہلکی ہو جاتی ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا متن اور خلاصہ ہے

ان آیات میں سورۂ فاتحہ کو قرآن عظیم کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک حیثیت سے پورا قرآن ہے، کیونکہ اصولِ اسلام سب اس میں سموئے ہوئے ہیں۔

محشر میں سوال کس چیز کا ہوگا

آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا ہے

کہ ان سب اگلوں پچھلوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی۔

صحابۂ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملہ کے متعلق ہوگا، تو آپ نے فرمایا قول لا الٰہ الا اللہ کے متعلق، تفسیر قرطبی میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد اس عہد کو علی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کیونکہ زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و ہیئت بنانے سے اور دین محض تمنائیں کرنے سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا ہو اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان کو اللہ کے محارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے (قرطبی)

تبلیغ وارشاد میں تدریج بقدر استطاعت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ، اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ بھی خفیہ ہی ایک ایک دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار و اعلان میں کفار کی ایذاء رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے استہزاء کرنے والے اور ایذاء دینے والے کفار کی ایذاء سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی، اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان و اظہار کے ذریعہ تلاوت و عبادت اور تبلیغ و دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

دشمنوں کی ایذاء سے تنگدلی کا علاج

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ، میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، عاص بن وائل، اسود بن المطلب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، حارث بن الطلاطلہ، یہ پانچوں معجزانہ طور پر ایک ہی وقت میں حضرت جبرئیلؑ کے اشارے سے ہلاک کر دیئے گئے، اس واقعہ سے تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں یہ حاصل ہوا کہ اگر انسان کسی ایسے مقام یا ایسے حال میں مبتلا ہو جائے کہ وہاں حق بات کو علی الاعلان کہنے سے اُن لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہونچنے کی توقع نہ ہو اور اپنے آپ کو نقصان و تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ کام خفیہ طور پر کرنا بھی درست اور جائز ہے، البتہ جب اظہار و اعلان کی قدرت ہو جائے تو پھر اعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دشمنوں کی باتوں سے رنج پہونچے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دور فرما دیں گے۔

سورۂ حجر تمام شد

سُوْرَةُ النَّحْلِ

سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَثَمَانُ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّسِتُّ عَشْرَةَ رُكُوْعًا	
سورۂ نحل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع	
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	
اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①	
آپہنچا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے	
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ	
اتارتا ہے فرشتوں کو بھیدے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں	
اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ②	
کہ خبردار کر دو کہ کسی کی بندگی نہیں سوا میرے، سو مجھ سے ڈرو	

خلاصۂ تفسیر

اس سورۃ کا نام سورۂ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب و غریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے، اس کا دوسرا نام سورۂ نعم بھی ہے (قرطبی) نعم بکسر نون نعمت کی جمع ہے، اس لئے کہ اس سورۃ میں خاص طور پر اللہ جل شانہٗ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی سزائے کفر کا وقت قریب) آپہنچا سو تم اس میں (منکرانہ) جلدی مت مچاؤ (بلکہ توحید اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے وہ اللہ تعالیٰ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی (یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہیں (یعنی انبیاء پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ (ہے) کہ لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت